بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

پاکستان کا مجموعی منظرنامہ اور مستقبل کی تعمیر

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

پاکستان کو آج جن اندرونی خطرات کا سامنا ہے، ان میں سیاسی عدم استحکام، معاشی بدحالی، حکومت اور عوام کے درمیان عدم اعتماد، حکومتی اداروں کے احترام کا اُٹھ جانا، حتیٰ کہ فوج کے احترام میں نمایاں کمی کے ساتھ ساتھ جرائم، خصوصاً خواتین اور بچوں کے ساتھ زیادتی کے دل خراش واقعات میں اضافہ شامل ہیں۔ یہ صورتِ حال ہر باشعور فرد کے لیے سخت تشویش کا باعث ہے۔

سیاسی جماعتوں کی باہمی الزام تراشیاں اور عدلیہ کے بعض فیصلوں کی بنا پر عدلیہ کی غیر جانب داری کا مشتبہ ہوجانا بھی قومی زندگی کا نہایت تشویش ناک پہلو ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ وہ دستوری ادارے بھی، جن کی طرف اُمید سے دیکھا جاتا تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ کم از کم وہاں سے انصاف کا حصول ممکن ہو سکے گا، اب کھلی عوامی تنقید کا نشانہ بن رہے ہیں۔

ان حالات میں ملک کے مستقبل کے بارے میں مایوسی اور پڑھے لکھے، ہنرمند نوجوانوں کی ملک سے باہر نقل مکانی میں اضافہ، اس تشویش میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔ ابلاغ عامہ چاہے وہ اخبارات ہوں، ٹی وی چینل ہوں، یا سوشل میڈیا یا اور کوئی ذریعۂ معلومات، ہر جگہ مایوس کن تبصروں کی بھرمار ہے۔ نتیجتاً معاشرہ ایک شدید تقسیم در تقسیم (polarization) اور ذہنی و فکری ہم آہنگی سے محرومی کا شکار ہو چکا ہے۔ اور نہ صرف سیاسی گروہوں کے درمیان بلکہ گھروں کے اندر بھی ایک واضح اختلافی تقسیم نظر آرہی ہے۔ اگر یہ غیر صحت مندانہ تقسیم اسی طرح بڑھتی رہی تو یہ حالات کو انتہائی نقصان دہ حد تک بلکہ ٹکراؤ کی طرف لے جا سکتی ہے جو ملکی یک جہتی اور اتحاد کے لیے تباہ کن ہوگا۔

مایوسی کی گھٹاؤں میں امید کی کرن کی تلاش پاکستان، خصوصاً نظریۂ پاکستان سے وفاداری کا تقاضا ہے۔ پاکستان دنیا کے نقشے پر محض برطانوی سامراج سے نجات پانے والے ایک ملک کے طور پر نہیں قائم ہوا، بلکہ انسانی تاریخ میں ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے طور پر وجود میں آیا ہے۔ جہاں اسلام کے عالم گیر اخلاقی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عدالتی اور انتظامی اصولوں کو نافذ کرکے دنیا کے سامنے ایک متبادل نظریۂ حیات کے طور پر پیش کیے جانے کا خواب دیکھا گیا تھا۔ پاکستان کا یہ عالمی کردار روزِ اوّل سے بانیان پاکستان کے سامنے واضح تھا اور قائداعظم محمدعلی جناح، قائدملت لیاقت علی خاں اور علّامہ اقبال کے درمیان اس امر پر مکمل اتفاق پایا جاتا تھا۔

لیکن قیام پاکستان سے ۹ سال قبل علّامہ اقبال کی رحلت اور قیام پاکستان کے ایک سال بعد قائداعظم کے انتقال کے نتیجے میں جو صورتِ حال پیدا ہوئی، اس میں بعض اندرونی قوتوں نے اقبال، قائداعظم اور لیاقت علی خاں کے متفقہ تصور کو نظرانداز کرتے ہوئے جو حکمت عملی اور طرزِعمل اختیار کیا، وہ ملکی سالمیت اور استحکام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے ۲۴برس بعد ملک کے ایک بڑے حصّے کا جدا ہوجانا اسی انحرافی طرزِعمل کا فطری نتیجہ تھا۔ آج معاشرتی انتشار، سیاسی عدم استحکام، معاشی زبوں حالی، ثقافتی انتشار، فکری پراگندگی، عدلیہ، فوج اور انتظامیہ کے عدم احترام کا پایا جانا جس تشویش کن صورت حال کو پیش کر رہا ہے، اس سنگین صورت حال کے پیدا ہونے میں تمام غیراخلاقی عناصر کا دخل ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان تمام مسائل کا سبب انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایک اخلاقی بحران (Ethical Crisis) ہے جس کا آغاز ۱۹۵۰ء کے عشرے میں ہوگیا تھا۔ یہاں ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جب تک انفرادی اور اجتماعی اخلاقیات کی اصلاح نہیں ہوتی، معاشی، سیاسی اور دفاعی خدشات اور خطرات کو دُور نہیں کیا جاسکتا۔

آج عوام الناس کے بعض طبقوں میں دین سے دُوری اور لاعلمی اور فحاشی کا رجحان، تاجر پیشہ طبقے کی مفاد پرستی، نوکرشاہی کی فرائض سے لاپروائی اور اداروں کے باہمی عدم تعاون، حتیٰ کہ ملک کی پاسبان افواج پاکستان کے وقار میں روز بہ روز کمی سمیت دیگر ہوش ربا مسائل کی کوئی ایک بنیادی وجہ تلاش کی جائے، تو وہ صرف اور صرف اسلام کے اخلاقی اصولوں سے انحراف اور دُوری ہے۔

اقوام کی ترقی محض مادی وسائل کے پیدا کرنے سے نہیں ہوتی بلکہ ان کی قوتِ اخلاق ان کے عروج یا زوال کی بنیاد بنتی ہے۔ مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرہ اور ریاست کا قیام کسی جبر اور آمرانہ طرزِ حکومت یا صنعتی انقلاب کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اس کی اخلاقی برتری ہی اس کی معاشی اور سیاسی کامیابی کی بنیاد بنی۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبت، رحمت، رواداری، عفو و درگزر کے اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغض و عناد سے بھرے دلوں کو رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ میں جس کامیابی کے ذریعے تبدیل کیا، وہ صرف اور صرف عمل صالح، صدق، امانت اور دیانت کی وہ چلتی پھرتی مثال تھی، جسے دیکھ کر پتھر دل افراد بھی موم کی طرح نرم ہوکر ایک نئے معاشرے اور ریاست کے معمار بن گئے۔

پاکستان کے باشعور افراد اور خصوصاً تحریک اسلامی کے لیے یہ ایک نادر موقع ہے کہ ایسے حالات میں جب سیاسی گروہوں میں شدید دُوری پائی جاتی ہے، ملکی معیشت اور معاشرت، عدم استحکام کا شکار ہے، آگے بڑھ کر جہاں کہیں اسے اختیار حاصل ہے، ایسی عملی مثالیں قائم کرے جن کو دیکھ کر ایک عام فرد کو اسلام کی عملیت اور معاشرتی مسائل کی اصلاح کرنے کی صلاحیت پر مکمل یقین اور اعتماد ہو جائے، نیز اسلام کے عملی نمونے کو دیکھ کر اس کا دل سکون اور اطمینان سے بھر جائے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ مقامی سطح پر کونسلوں کے دائرۂ کار میں جو سماجی اور معاشرتی فلاح کے کام آتے ہیں، انھیں امانت اور دیانت کے ساتھ ہاتھ میں لے کر منتخب کردہ علاقوں، شہروں اور دیہات پر توجہ مرکوز کی جائے اور ۲۵ برس پہلے والی ترکی کی اصلاح پسند سیاسی حکمت عملی کے نقشے کو ملکی یا مقامی حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے رُوبہ عمل لایا جائے۔ یہ کام جتنے خلوص و قربانی اور بےلوثی سے ہوگا، اتنا ہی اس کا نتیجہ مثبت اور کامیاب نکلے گا۔

نوجوانوں کی قوت کا استعمال

دوسرا بنیادی کام پاکستان کی نوجوان آبادی کو معاشرتی فلاح کے کاموں میں رضاکارانہ طور پر شامل کر کے ان کی بے پناہ قوت کا تعمیری استعمال ہے۔ ہمارے نوجوانوں میں نہ صلاحیت کی کمی ہے اور نہ قیادت میں وہ کسی سے پیچھے ہیں۔ صرف انھیں صحیح سمت، مقصد حیات اور تنظیم کے ذریعے منتشر اعضا کی جگہ ایک صحت مند جسم میں تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ تحریکِ اسلامی کے

مختلف اداروں اور اس سے وابستہ لوگوں نے اس سلسلے میں جو روشن مثالیں پیش کی ہیں، انھیں وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

ہماری ترجیح طویل المیعاد نوجوان قیادت کی تیاری ہونی چاہیے، جو فلاحی کاموں میں شامل ہوکر عملی تربیت سے ہی پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ کام محض تقریری محفلوں سے نہیں ہوسکتا۔ الخدمت کے ماڈل پر بے شمار ایسے پراجیکٹ متعارف کرائے جاسکتے ہیں، جو نوجوانوں کو صحیح سمت اور تربیت فراہم کرسکیں۔ ایک چھوٹی سی مثال مقامی سطح پر صحت مند ماحول پیدا کرنے کے لیے صفائی کی مہم ہے۔ چاہے شہر بڑے ہوں یا چھوٹے، ہر گلی کوچہ کوڑا کرکٹ اور غلاظت اور تعفن سے بھرا پڑا ہے۔ اگر نوجوان رضاکار اپنی تحریکی پہچان کے ساتھ صرف اس ایک کام کو ایک متعین مدت میں مکمل کرانے کے لیے معاشرے ہی سے مدد لے کر کام کریں، تو ہر شہری اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ کسی مالی معاونت اور کسی بڑے ادارے کو بھاری ٹھیکہ دیے بغیر کس طرح صالح نوجوان اپنی مدد آپ کے اصولوں پر عمل پیرا ہوکر گندگی اور غلاظت کو دُور کرکے ایک صاف ستھرے ماحول کا قیام عمل میں لاسکتے ہیں۔ اس طرح اشیا کی آلایشوں سے صاف معاشرہ، فکری آلایشوں سے صفائی کے لیے بھی تیار ہوسکتا ہے۔ اس معاشرے کو خوب صورت گلستان میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

خاندان کا تحفظ

ملکی معیشت اور سیاسی عدم استحکام کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ بات ذہن سے نہیں اوجھل ہونی چاہیے کہ ملکی حالات میں بنیادی طور پر خاندان کا اثر سب سے گہرا ہوتا ہے اور آج مغرب کی اندھی پیروی سے ہمارے خاندان کو سب سے زیادہ توڑ پھوڑ کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ اب نوبت یہ آگئی ہے کہ خاندان کے بنیادی تصور کو نوجوان نسل کے سامنے صرف اور صرف حصولِ لذت کے ایک آزادانہ تصور سے تبدیل کیا جارہا ہے کہ انسان جو اصل میں ایک اخلاقی وجود رکھتا ہے، اور اس بنا پر حیوانات سے ممتاز ہے، اس کی ایک نئی تعبیر ایسی پیش کی جارہی ہے، جو حیوانات کی دنیا میں بھی اجنبی ہے۔

حیوانات میں بھی بعض حیوانات اپنی جنسی عادات کی بنا پر مہذب معاشروں میں ایسے الفاظ سے بیان کیے جاتے ہیں جو ان کی عادات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اور ان کے جنسی تعلق

کو براہِ راست بیان کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اُردو ادب کے اندر 'جنگل والا' اور بازاری کتے اور کتیا جیسے الفاظ استعارۃً اس جنسی بے راہ روی کو محتاط الفاظ میں بیان کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان حیوانات کی جنسی بے راہ روی نے انھیں یہ نام دلوائے۔ آج اس طرز کے جنسی تعلق کو 'انسانی حقوق' کے نام پر ہمارا ابلاغِ عامہ، پارلیمنٹ، حتیٰ کہ عدالتیں بھی تسلیم کررہی ہیں، جسے حیوانات بھی 'حیوانی حقوق' کہتے ہوئے شرمائیں۔

ان حالات میں ہر شہر، بستی اور گاؤں میں خاندانی نظام کی اہمیت، نیز اس کی تعمیر، اصلاحی اور اخلاقی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ خاندانی نظام کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے مساجد، بازاروں، اسکولوں اور دیگر سماجی میل جول کے فورموں کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ کو روکنے کے لیے محلے کی سطح پر ایسے فیملی کونسلرز کا رضا کارانہ نظام بھی وضع کیا جاسکتا ہے، جہاں اجتماعی طور پر خاندانوں میں مفاہمت اور ٹوٹتے رشتوں کو جوڑنے کی کوشش کی جائے۔

ابھی حال ہی میں ملک کی ایک یونی ورسٹی نے چار، چار ماہ کے ایک آن لائن کورس کے ذریعے، کئی سو شرکا، جن میں خواتین کی اکثریت تھی، کو تربیت دی کہ وہ کس طرح خاندان کو اکیسویں صدی میں انتشار سے نکال کر مودت و رحمت کا مرکز بنا سکتے ہیں۔

اختلاف کے آداب

اختلاف کرنا اور کسی معاملے میں دلائل کی بنا پر ایک رائے قائم کرنا اور اسے پیش کرنا قرآن کریم کا دیا ہوا ایک حق ہے، اسی کا نام 'شوریٰ' ہے، لیکن شوریٰ اور مشاورت میں ادب اور اعتدال کا پایا جانا شرط ہے۔ یہ ملکی سیاسی معاملات ہوں یا معاشی اور دفاعی حکمت عملی، کسی بھی موقع پر دلیل کی بنیاد پر ایک رائے قائم کرنا ایک دستوری حق ہے، لیکن جس کسی کو اس رائے سے اختلاف ہو، اس کا نام بگاڑنا، اس پر استہزا کرنا، اسے تمسخر اور عوام کی نگاہ میں کمتر انسان کے طور پر پیش کرنا نہ قرآن وسنت نے مباح کیا ہے اور نہ کسی بھی مہذب معاشرے میں اسے گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آج ان حضرات میں سے بھی کچھ (جن کی طرف لوگ قرآن وسنت کے فہم کے حصول کی نیت سے دیکھتے ہیں) کا سیاسی لہجہ قرآن کے اصولوں کی ضد بن گیا ہے، اور

قرآن نے سورۃ الحجرات میں جن آدابِ گفتگو کا درس دیا ہے، ہم ان سے بہت دُور چلے گئے ہیں۔

اسلام اصلاحِ معاشرہ کے لیے امید، تعاون باہمی اور حق و انصاف کو بنیاد بناتا ہے اور ہر مشرک کو ایک ممکنہ مومن کے طور پر مخاطب کر کے اسلام سے قریب لانے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن شرک کا شدید ترین ردّ دلیل کی بنیاد پر کرتا ہے، لیکن مشرکوں کے خداؤں تک کو بُرے نام سے یاد کرنے سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ کسی سیاسی حریف کو ایسے القاب سے یاد کرنا جو اسے دُور لے جانے والے ہوں، ایک غیراسلامی اور غیراخلاقی حرکت ہے۔

تحریک اسلامی کا فرض ہے کہ وہ ایسی مثبت، سنجیدہ اور باوقار زبان استعمال کرے جو مخالف کو بھی حق کی بنا پر اپنی رائے پر غور کرنے اور حق کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دے۔ یہ رحمۃ للعالمینؐ کی شیریں بیانی تھی جس نے کفروفسق میں ڈوبے افراد کو سہارا دے کر گمراہی سے نکال کر نورِ حق تک پہنچنے میں مدد فراہم کی۔ اسی اخلاق اور اسی سیرت کی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے جو دلوں کو جوڑ دے اور اُمت مسلمہ کو ایک بنیانِ مرصوص میں تبدیل کر دے ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

بڑا دعویٰ، بڑا کام

جماعت کے ارکان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک بہت بڑا دعویٰ لے کر بہت بڑے کام کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ اگر ان کی سیرتیں ان کے دعوے کی نسبت سے اس قدر پست ہوں کہ نمایاں طور پر ان کی پستی محسوس ہوتی ہو تو وہ اپنے آپ کو اور اپنے دعویٰ کو مضحکہ بنا کر رکھ دیں گے۔ اس لیے ہر شخص کو جو اس جماعت میں شامل ہو، اپنی دُوہری ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے۔ خدا کے سامنے تو وہ بہرحال ذمہ دار ہے ہی، مگر خلق خدا کے سامنے بھی اس کی ذمہ داری بہت سخت ہے۔

جس بستی میں آپ موجود ہوں، وہاں عام آدمی سے آپ کے اخلاق بلند تر ہونے چاہییں، بلکہ آپ کو بلندیٔ اخلاق، پاکیزہ سیرت اور دیانت و امانت میں ضرب المثل بن جانا چاہیے۔

ہمارے کرنے کا بنیادی کام یہ ہے کہ ہم اپنے خواص و عوام کو توحید کی دعوت دیں۔ ان کے سامنے اقامتِ دین کا مقصد رکھیں اور اس مقصد کے لیے انھیں تیار کریں کہ وہ خود اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ سارے معاشرے میں اسی پیغام کو آگے پھیلائیں۔

ہمیں تحریر اور تقریر کے علاوہ انفرادی سطح پر بات کر کے اپنے اپنے حلقہ ہائے ربط میں تعمیری سیاست اور تعمیر پسند قیادت کا صحیح اسلامی تصور پھیلانا چاہیے۔

بطورِ خاص یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دوسروں کی مار چونکہ صرف تقاریر اور اخباری بیانات تک ہے۔ اس لیے اگر انفرادی رابطوں کے ذریعے ہر سطح پر تحریکِ اسلامی کے کارکن اصولی و تعمیری سیاست کا شعور پیدا کرنے کی مہم میں لگ جائیں، تو ایک سال کے عرصے کا زوردار کام بھی بہت نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

رُوداد جماعت اسلامی، اوّل

عطیۂ اشتہار: صوفی بابا